Fikr-o-Nasar (Islamabad) 6:1 (1968)

زکوٰۃ کے مصارف

سید یعقوب شاہ، سابق آڈیٹر جنرل پاکستان

احکام زکوٰۃ کی موجودہ [illegible] کے مطابق غنی، آل ہاشم اور غیر مسلم پر زکوٰۃ خرچ نہیں کی جا سکتی۔ اگر زکوٰۃ کو ایک قسم کا ٹیکس تسلیم کیا جائے تو اس کے مصارف میں ان احکام کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

پہلی قسط میں ان امور پر بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان احکامِ زکوٰۃ کی دوسری تاویل بھی کی جا سکتی ہے۔ مدیر

(۱۱) اب اس شرط کو لیجئے کہ زکوٰۃ جس کو دی جائے مالک بنا کر دی جائے۔ اس زمانے میں شائد تملیک ذاتی ہی امداد پہنچانے کا بہترین ذریعہ تھا۔ لیکن موجودہ زمانے میں بے شمار لوگ ایسے ہیں کہ اگر انھیں بے محنت کھانے اور بے تلاش پانے کو مل جائے تو وہ اسے محنت مزدوری کی زندگی پر ترجیح دیں گے۔ اس لئے اب مدد کرنے کا بہترین طریقہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ مستحق کو خیرات کی جگہ کام مہیا کیا جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ زکوٰۃ کمیٹی نے بھی اختیاری طور پر اکٹھی کی ہوئی زکوٰۃ کے خرچ کے لئے جہاں اداروں کے قیام کی تجویز کی ہے، وہاں ان میں مقیم لوگوں کے لئے روزی پیدا کرنے کے انتظامات کی بھی سفارش فرمائی ہے[۲۴]۔ اس طرح امداد حاصل کرنے والے کی خودداری کی روح اور اخلاقی غیرت کی حس کو صدمہ نہیں پہنچتا اور نہ کام چوری اور کاہلی کی عادت پڑنے کا خطرہ رہتا ہے۔ مگر اوائل اسلام میں تنظیم ملّی کی شکل آج سے کچھ مختلف تھی۔ تقریباً ہر کام انفرادی حیثیت سے ہوتا تھا۔ ملک کے دفاع کا بار ہر فرد

---

[۲۴] شق ۲ و ۳ فقرہ ۳۲ ص ۱۴۷۰ پاکستان گزٹ خصوصی مورخہ ۲۲ جولائی ۱۹۵۴ء

ملت پر تھا۔ جب جہاد کا اعلان ہوتا تھا، صحت مند اشخاص پر حاضری لازمی تھی۔ اور انھیں سواری اور سامان حرب ساتھ لانا ہوتا تھا۔ لیکن اگر کسی کے پاس نہ ہوتا تو زکوٰۃ سے اس کی امداد کر دی جاتی۔ جو صاحب علم ہوتا اور تدریس کی ذمہ داری اٹھانا چاہتا، وہ اپنے ارد گرد شاگردوں کا حلقہ اکٹھا کر لیتا۔ اگر وہ روزی کمانے کے قابل نہ ہوتا تو زکوٰۃ سے امداد کا مناسب انتظام کر دیا جاتا۔ غرضیکہ نہ تنخواہ دار فوج تھی نہ محکمہ تعلیم۔ نہ محکمہ رسل و رسائل وغیرہ۔ نہ یتیم خانے نہ بیوہ گھر نہ اپاہج گھر۔ پس اگر کسی مجاہد یا مدرس یا یتیم کی امداد کرنا مقصود ہوتا تو اسے زکوٰۃ کے مال کا مالک بنا دیا جاتا۔ لیکن اس قسم کی امداد میں یہ خطرہ رہتا ہے کہ بے محنت پانے والا کام چور نوالہ حاضر بن جائے گا۔ اس نقص کو بعض دور اندیش لوگوں نے شروع میں ہی بھانپ لیا تھا۔ مگر چونکہ اس وقت متبادل ذرائع موجود نہ تھے اس لئے ان کا اعتراض کارگر نہ ہوا۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ حکیم بن حزام نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا تھا۔ " امیر المومنین! قریش کا پیشہ تجارت ہے۔ جب ان کے وظیفے مقرر ہو جائیں گے تو وہ تجارت چھوڑ دیں گے۔ اس کے بعد جب ان کا وظیفہ کسی سبب سے بند ہو جائے گا اور وہ آپ کے پاس آئیں گے۔ اس وقت ان کی تجارت ان کے ہاتھوں سے نکل چکی ہوگی۔" لیکن آج کل جب کہ امداد کے اور ذرائع موجود ہیں، ذاتی ملکیت پر اصرار کر کے اس خطرہ کو مول لینا دانش مندی نہیں ہے۔

(۱۲) تملیک ذاتی پر اصرار کے دو دلائل قرآن پاک سے پیش کئے جاتے ہیں۔ اوّل یہ کہ سورہ توبہ کی آیت "انما الصدقات للفقراء" میں لام کو لام تملیک لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ لام انتفاع بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ آیت: خلق لکم ما فی الارض جمیعا میں ہے [۲۵] ابن حیان اس کو لام اختصاص بتاتے ہیں [۲۶] دوم یہ کہ زکوٰۃ کے ساتھ لفظ "آتوا" کئی جگہ آیا ہے اور لفظ ایتاء قرآن کریم میں مِلک بنا دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً: "آتوا النساء صدقاتھن" یعنی دے دو عورتوں کو ان کے مہر۔ لیکن سورہ مزمل کی آیت" اقیموا الصلوٰۃ و آتوا الزکاۃ " میں لفظ زکوٰۃ محض خیرات کے معنی میں استعمال ہوا ہے [۲۷] اور محض خیرات کے لئے تملیک ذاتی لازم نہیں اور کنواں۔ تالاب۔ مسجد وغیرہ بنانا سب کار خیر ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ ایتاء کے ساتھ ذاتی تملیک لازم نہیں۔ غور کرنے پر نظر آتا ہے کہ

---

[۲۵] تحفۃ الفقہاء وللسمرقندی ص ۶۳۰ [۲۶] تفسیر بحر محیط ۔ [۲۷] پیرا ۲-

علمائے کرام نے یہ شرط شائد اس لئے عائد کی ہے کہ :

ان لایکون منافع الاملاک متصلۃ بین صاحب المال وبین المدفوع الیہ [۲۸]	تاکہ یہ نہ ہو کہ صاحب مال خود بھی اس سے فائدہ اٹھاتا رہے۔

لیکن جہاں یہ خطرہ موجود نہ ہو، وہاں اس شرط کی ضرورت نہ ہونی چاہیئے۔ لیکن بدقسمتی سے اس پر محل بے محل اصرار کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک غریب کا لاشہ بے گور و کفن پڑا رہے مگر زکوٰۃ سے اس کی تجہیز و تکفین نہیں کی جاسکتی کیونکہ مردہ کو زکوٰۃ کا مالک نہیں بنایا جاسکتا۔

(۱۳) صحیح بخاری کتاب الزکاۃ میں لکھا ہے :

ویذکر عن ابی الاس حملنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی ابل الصدقۃ للحج	اور ابوالاس سے منقول ہے کہ ہم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کے اونٹ پر سوار کرکے حج کرنے کے لئے بھیجا

اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ حکومت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ مال زکوٰۃ کی ملکیت فائدہ اٹھانے والے کو منتقل کردے بلکہ اسے اپنے قبضہ میں رکھ کر حاجت مندوں کو اس سے متمتع ہونے کا موقع دینا بھی جائز ہے۔

(۱۴) اپنی دانست میں احقر نے یہ ثابت کردیا ہے کہ تملیک ذاتی کی شرط نہ قرآن اور نہ حدیث نے عائد کی ہے۔ بلکہ اُس وقت کے حالات کے پیش نظر اور زکوٰۃ دینے والے کو اس سے فائدہ اٹھاتے رہنے سے روکنے کے لئے فقہاء کرام نے اسے نافذ کیا ہے۔ اب اگر ایسے حالات پیدا ہوجائیں جن میں یہ شرط مفید کی بجائے مضر صورت اختیار کرے تو اسے ساقط کرنے میں کوئی حرج نہ ہونا چاہیئے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ اوائل اسلام میں بھی ملّت کے دفاع، لوگوں کی تعلیم، بیماروں کے علاج اور یتیموں کی خبرگیری ایسی مدات پر زکوٰۃ کا روپیہ خرچ کیا جاسکتا تھا۔ اب اگر دفاع کی تنظیم میں اس قسم کی تبدیلی واقع ہوگئی ہے کہ اس کے لئے سالوں کی تربیت یافتہ فوج درکار ہے۔ اور آلاتِ حرب اس قدر قیمتی وزنی اور خطرناک ہوگئے ہیں کہ انھیں افراد ملّت کی ملکیت میں نہیں دیا جاسکتا تو دفاع مصرف زکوٰۃ سے کیوں خارج ہوجائے؟ یہی سوال مدارس شفاخانوں اور یتیم خانوں وغیرہ کے متعلق پیدا ہوتا ہے۔ اگر بچوں کی تعلیم، بیماروں کا علاج اور یتیموں کی خبرگیری زکوٰۃ کے صحیح مصرف تھے تو ملّی سطح پر علاج کا انتظام کرنے سے اس کا خرچ زکوٰۃ کے زمرے

---

[۲۸] تحفۃ الفقہاء للسمرقندی : ۶۳

سے کیوں نکل جائے؟ تملیک ذاتی پر اصرار سے جہاں ایک طرف افراد قوم کے کام چور بننے کا خدشہ ہے، وہاں دوسری طرف دفاع ملک اور فلاح ملّت کو بھی ٹھیس لگنے کا خطرہ ہے۔ اس لئے اس شرط کا سقوط ضروری ہے۔

(۱۵) پاکستان جس مرحلہ سے گزر رہا ہے، اس میں دفاع کو مضبوط رکھنا ہمارا اوّلین فرض ہے۔ ہمارا ملک ایسی جگہ واقع ہے کہ جب تک عالمی امن قائم نہیں ہو جاتا، ہمارے لئے دفاع کی اہمیت باقی رہے گی۔ اس کا تمام خرچ زکوٰۃ پر ڈالا جا سکتا ہے۔ سوائے امام شافعیؒ کے باقی ائمہ فقہاء حکومت کو اس بات کا اختیار دیتے ہیں کہ جس صنف کو چاہے، ترجیح دے۔ اور جس صنف کو چاہے، محروم کر دے۔ قاضی ابو یوسف حضرت ابن عباسؓ کی روایت بیان کرتے ہیں: قال: لا بأس ان تعطی الصدقۃ فی صنف واحد یعنی اس میں کوئی حرج نہیں کہ زکوٰۃ کو صرف ایک ہی صنف میں خرچ کیا جائے[۲۹] دفاع کے بارے میں امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ویعطی الغزاۃ الحمولۃ والرحل والسلاح والنفقۃ والکسوۃ[۳۰] یعنی "مجاہدوں کو بار برداری کا سامان سواری، اسلحہ، خوراک اور کپڑے دیئے جائیں"۔ ماوردی لکھتے ہیں: ان کو اس میں سے جہاد کی ضرورت کے موافق دیا جائے"۔[۳۱] ابن حیان اپنے اسناد عبد الکریم سے روایت کرتے ہیں: ویجعل من الصدقۃ والکراع والسلاح وما یحتاج الیہ من آلات الحرب وکف العدو[۳۲] یعنی "سواری، ہتھیار، لڑائی کے سامان اور دشمن کی مدافعت کے لئے جس چیز کی حاجت ہو ان سب کا خرچ زکوٰۃ سے ملے گا۔" پس دفاع کا تمام تر خرچ چاہے وہ چھاؤنی یا سڑکوں کی تعمیر ہو یا اسلحہ جہاز یا ٹینک کی خرید ہو، زکوٰۃ سے ادا کیا جا سکتا ہے۔

(۱۶) اسی طرح رفاہی محکموں مثلاً محکمہ تعلیم، محکمہ حفظان صحت، محکمہ رسل و رسائل اور محکمہ خدمت عامہ وغیرہ کا بیشتر خرچ زکوٰۃ سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ سوائے ان اداروں کے خرچ کے جو امراء کے لئے مخصوص ہیں۔ مثلاً پبلک اسکول، خاص خاص کالج، شفاخانوں میں خصوصی کمرے وغیرہ۔ اس قسم کے خرچ پر شریعت کی مروجہ تاویل کے لحاظ سے جو اعتراضات ہوتے ہیں، ان کا بڑی حد تک جواب

---

[۲۹] کتاب الخراج ص ۴۶ [۳۰] کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ باب مصرف الزکوٰۃ

[۳۱] احکام سلطانیہ مترجمہ مفتی انتظام اللہ شہابی ص ۲۹۲ [۳۲] تفسیر بحر محیط

دیا جا چکا ہے۔ مزید وضاحت کے لئے عرض ہے کہ یہ سب کام فی سبیل اللہ یا ابن سبیل کے تحت آتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام صاحب آزاد فرماتے ہیں: "فقہاء و مفسرین کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے (کہ فی سبیل اللہ کا اطلاق دفاع تک محدود رہے) اور بعضوں نے اس درجہ عام کر دیا ہے کہ مسجد، کنویں، پل اور تمام اس طرح کی تعمیرات خیر یہ بھی اس میں داخل کر دیں۔" قیل ان اللفظ عام فلا یجوز قصرہ علی نوع خاص و یدخل فیہ جمیع وجوہ الخیر من تکفین الموتی و بناء الجسور والحصون و عمارۃ المساجد و غیر ذلک [۳۳] یعنی یہ لفظ عام ہے اور اسے ایک خاص نوع تک محدود کر دینا جائز نہیں اور اس میں سب کارِ خیر داخل ہیں. مثلاً مُردوں کی تکفین، چھاؤنیوں، قلعوں، مساجد کی تعمیر اور اسی قسم کے اور کام۔ فقہاء حنفیہ میں سے صاحب فتاویٰ ظہیریہ لکھتے ہیں: المراد طلبۃ العلم یعنی اس سے مراد طالب علم ہیں اور صاحب بدائع کے نزدیک وہ تمام کام جو نیکی اور خیرات کے ہوں اس میں داخل ہیں [۳۳] سید سلیمان صاحب ندوی قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج کے باب الصدقات کے حوالہ سے لکھتے ہیں" اور ابن سبیل میں مسافروں کی ذاتی مدد کے علاوہ مسافروں کی راحت رسانی کے سامان کی تیاری مثلاً راستوں کی درستی پُلوں اور مسافر خانوں کی تعمیر بھی داخل ہو سکتی ہے۔" اور اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان ممالک میں جگہ جگہ سرائے مسافر خانے، کنویں اور مہمان خانوں کا ایک وسیع سلسلہ قائم ہو گیا تھا [۳۴] قاضی صاحب بھی لکھتے ہیں: وسھم فی اصلاح طرق المسلمین [۳۵] یعنی زکوٰۃ کے مال میں سے مسلمانوں کے مختلف معاملات میں اصلاح اور استحکام کے لئے کیا خرچ کیا جا سکتا ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں: واعلم ان ظاھر اللفظ فی قولہ و فی سبیل اللہ لا یوجب القصر علی کل الغزاۃ فلھذا المعنی نقل القفال فی تفسیرہ عن بعض الفقہاء انھم اجازوا صرف الزکوۃ الی جمیع وجوہ الخیر من تکفین الموتی و بناء الحصون و عمارۃ المساجد انہ قولہ فی سبیل اللہ عام فی الکل [۳۶] یعنی" اللہ تعالیٰ کے قول فی سبیل اللہ کے

---

۳۳ نیل الاوطار

۳۳ ب ترجمان القرآن حصہ دوم۔ ص ۱۳۰ ۳۴ سیرۃ النبی طبع دوم۔ ج ۵ - ص ۲۳۷

۳۵ کتاب الخراج باب فی النقصان والزیادۃ والضیاع ص ۶۴ ۳۶ تفسیر کبیر مطبوعہ مصر۔ ص ۱۸۱

الفاظ سے یہ واجب نہیں آتا کہ اسے غازیوں تک محدود رکھا جائے۔ انہی معنی میں قفال نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ بعض فقہاء سب کار خیر پر زکوٰۃ سے خرچ کرنے کی اجازت دیتے ہیں مثلاً مُردوں کی تکفین اور قلعوں اور مسجدوں کی تعمیر کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قول فی سبیل اللہ کے لئے عام استعمال ہوا ہے"۔

شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں: والسر فی ذلک ان الحاجات غیر محصورۃ ولیس فی بیت المال فی البلاد الخالصۃ للمسلمین غیر الزکوٰۃ کثیر مال فلابد من توسعۃ لتکفی نوائب المدینۃ: یعنی اس میں بھید یہ ہے کہ حاجات بے شمار ہیں اور خالص اسلامی شہروں کے بیت المال میں زکوٰۃ کے سوا کچھ زیادہ مال نہیں ہوتا۔ پس ضروری ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف میں شہری ضروریات کے پیش نظر وسعت کا پہلو لیا جائے"[۳۷] امام مالک کا فتویٰ ہے کہ :۔ سبیل اللہ کثیر ...... وفیھا الغزو[۳۸] یعنی سبیل اللہ کی بہت سی اصناف ہیں ..... اور ان میں سے ایک جہاد ہے۔

(۱۷) امید ہے کہ سطور بالا سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ قرآن اور حدیث کے حساب سے زکوٰۃ کے صحیح مصرف کے لئے یہ ضروری نہیں کہ زکوٰۃ سے مستفید ہونے والا غنی یا سید یا غیر مسلم نہ ہو اور نہ تملیک ذاتی ہی لازمی شرط ہے۔ یہ ضروری ہے کہ بعض فقہاء نے اس کے برخلاف فتوے دیئے ہیں لیکن ان بزرگانِ دین نے اپنے لئے معصومیّت اور اپنے فیصلوں کے لئے ابدیت کا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ ان کے فیصلے ان کے گردوپیش کے حالات کے عکاس تھے۔ اور آج ہمیں انھیں موجودہ حالات سے مطابقت دینا ہے۔ مذاہب اربعہ کے ایمہ میں سے امام احمد بن حنبلؒ سب سے آخر میں فوت ہوئے۔ ان کا سن وفات ۲۴۱ھ مطابق ۸۵۵ء ہے۔ یعنی گیارہ سو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس طویل مدّت میں مسلمان قوم کا بڑے بڑے حادثات سے سابقہ پڑا ہے اور اس کی تنظیم میں بے شمار ایسی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں، جنھوں نے پہلے فیصلوں کی افادیت کو مشکوک بنا دیا ہے۔ ان میں سے چند پر نظر ڈالیے:۔

(۱) ان دنوں غنیمت حکومت کی آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ تھا اور زکوٰۃ کے کئی مصارف اس سے پورے کئے جاتے تھے۔ اب یہ ذریعہ مفقود ہے۔ اس لئے ان مصارف کا بار اب زکوٰۃ پر ڈالا جا سکتا ہے۔

---

[۳۷] برھان الٰہی حصّہ دوم۔ ص ۱۲۵ - ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ

[۳۸] کتاب الاحکام لابن العربی جلد ۲۔ ص ۳۹۶

(۲) تجربہ نے بتادیا ہے کہ مال کی بجائے کام مہیا کرنا امداد کا زیادہ مؤثر اور مفید طریقہ ہے۔ اس لئے اداروں کے واسطے سے زکوٰۃ صرف کرنا ذاتی تملیک سے بہتر ہے۔

(۳) اس وقت جو محاصل وصول کئے جاتے تھے، انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تجویز کردہ طریقہ سے مماثلت تھی اور اس حد تک آسانی سے زکوٰۃ میں مجرا ہو سکتے تھے۔ لیکن آج کل کا طریقہ بہت مختلف ہے۔ اب اندوختہ کی بجائے سالانہ آمدنی پر ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ انکم ٹیکس نے فی زمانہ جو صورت اور وسعت حاصل کرلی ہے، اس کے پیش نظر یہ بات وجہ حیرت نہ ہونی چاہیئے کہ اسے ادا کرنے کے بعد لوگ زکوٰۃ کی ادائیگی کو بار سمجھتے ہیں۔

(۴) اس وقت مسلمان حاکم اور غیر مسلم محکوم ہوتے تھے اور مسلمان حکومتیں ایک بہت بڑی مرکزی خلافت سے منسلک تھیں۔ اب نہ وہ خلافت ہے نہ وہ یک جہتی۔ چھوٹی چھوٹی سلطنتیں ہیں جو کئی جگہ ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ اکثر میں غیر مسلم عنصر معتدبہ تعداد میں موجود ہے جس کی تالیف القلوب پر ملک کی سالمیت کا انحصار ہے اور جو برابری کے سلوک کا طلب گار ہے۔ ان تغیرات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیے اور پھر فیصلہ کیجیئے کہ احکام زکوٰۃ کی جو تعبیر آج سے کئی سو سال قبل کی گئی ہے وہ آج کل کہاں تک کارگر ہو سکتی ہے۔

(۱۸) ہمارے بزرگانِ دین بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ اسلام میں مذہب اور سیاست علیحدہ علیحدہ نہیں ہیں۔ مگر جب زکوٰۃ کا ذکر آتا ہے تو ان میں سے کئی اسے خالص عبادت قرار دینے پر مُصر ہوتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ قرآن پاک نے حکومت کی مالی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بھی تو کوئی انتظام کیا ہوگا۔ احقر کا خیال ہے کہ زکوٰۃ کا نظام ایک صالح حکومت کی اساسی ضروریات کے لئے کافی ہے۔ اگر اس پہلو کو زیر غور رکھا جائے تو زکوٰۃ کے مصارف کی صحیح تعبیر آسان ہو جائے گی۔ پھر نہ فقر و مسکنت پر اصرار ضروری ہوگا نہ تملیک ذاتی پر۔ اور ہر وہ کام جو براہ راست یا بالواسطہ دین و ملت کی حفاظت و تقویت کے لئے ہو، مصرف زکوٰۃ بن جائے گا۔

شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں:۔ "نیز یہ کہ نظام شہری کا دار و مدار کچھ ایسے مال پر ہے کہ جس کے ذریعہ محافظین شہر، منتظمین و مدبرین جو شہری سیاست و تنظیم میں مشغول و مصروف ہوں، ان کی معیشت و معاشرت کی کفالت کی جائے اور چونکہ یہ لوگ شہر کے لئے مفید عمل اور نافع خدمات انجام دیتے ہیں اور

ان مشغولیتوں اور مصروفیتوں کی وجہ سے اپنی روزی اور کفالت کے لئے اکتساب و تحصیل کی انھیں فرصت نہیں ملتی۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان لوگوں کی معیشت اور معاشرت کا بار بھی شہر والوں پر ڈالا جائے۔ کیونکہ شہر کے اس قسم کے نفاقات اور مصارف صرف چند آدمی برداشت نہیں کر سکتے اور پھر یہ کہ کچھ آدمی تو اس قسم کے ہوتے ہیں کہ اس قسم کے مصارف کی سرے سے قدرت و استطاعت بھی نہیں رکھتے۔ پس ضرور ہوا کہ رعایا سے مال وصول کرنے کا ایک مفید طریقہ رائج اور قائم کیا جائے اور چونکہ آسان اور مصلحت آمیز وہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ ایک مصلحت کو دوسری مصلحت کے اندر داخل اور شامل کر دیا جائے۔ لہٰذا شریعت نے ایک مصلحت کے اندر دوسری مصلحت کو داخل کر دیا۔"[39]

(۱۹) بعض اصحاب کہتے ہیں کہ چونکہ ہمارے ملک میں اسلامی قانون نافذ نہیں ہے، اس لئے جو محاصل ہماری حکومت وصول کرتی ہے، انھیں زکوٰۃ میں مجرا نہیں کیا جا سکتا۔ گو مماثلت مکمل نہیں، تاہم بنوامیہ کے بارے میں علماء کے فیصلے سے ہم سبق سیکھ سکتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں: "بنوامیہؓ کے زمانے میں جب نظامِ خلافت بدل گیا اور حکام ظلم و تشدد پر اتر آئے تو بعض لوگوں کو خیال ہوا، ایسے لوگ ہماری زکوٰۃ کے کیوں امین سمجھے جائیں؟ لیکن تمام صحابہ نے یہی فیصلہ کیا کہ زکوٰۃ انہی کو دینی چاہیئے۔ یہ کسی نے نہیں کہا کہ اپنے ہاتھ سے خرچ کر ڈالو۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ایک شخص نے پوچھا اب زکوٰۃ کسے دیں؟ کہا وقت کے حاکموں کو۔ اس نے کہا: اذن یتخذون بھا ثیابا و طیبا! وہ تو زکوٰۃ کا روپیہ اپنے کپڑوں اور عطروں پر خرچ کر ڈالتے ہیں۔ فرمایا: وان۔ اگرچہ ایسا کرتے ہوں دو انھی کو۔"[40]

(۲۰) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انکم ٹیکس جو آمدنی پر عائد ہوتا ہے، زکوٰۃ میں جو اندوختہ پر لگتی ہے، محسوب نہیں ہو سکتا۔ یہ اعتراض خاکسار کی رائے میں بہت کمزور ہے۔ اوّل زکوٰۃ صرف اندوختہ پر ہی عائد نہیں ہوتی بلکہ زمین کی پیداوار کی صورت میں ہر فصل کا ایک حصہ لیا جاتا ہے، یعنی آمدنی پر لگتی ہے۔ اس لئے آمدنی کے حساب سے ٹیکس وصول کرنا اصولاً ممنوع نہیں۔ اور اس کے ذریعہ زکوٰۃ وصول کی جا

---

[39] برھان الٰہی از ابوالعلاء محمد اسمٰعیل صاحب گودھروی ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ۔ حصہ دوم ص ۱۱۰

[40] ترجمان القرآن حصہ دوم ص ۱۳۲

سکتی ہے۔ نیز ہر شخص کو اس کا اندازہ خود کرنا ہوگا کہ شریعت کے مطابق اس کے ذمہ کتنی زکوٰۃ نکلتی ہے اور اس میں سے کتنی وہ حکومت کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ یہ سپردگی موجودہ ٹیکسوں کے ذریعہ سے ہو یا کسی اور طرح، اس سے ادائیگی زکوٰۃ پر اثر نہیں پڑتا۔ کہا جاتا ہے کہ امام ابن تیمیہ کا مسلک بھی اسی قسم کا تھا۔ وہ اس سے کچھ آگے جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایسے لگان (ٹیکس) جو احکام الٰہی سے فرض نہیں کئے گئے جائز نہیں اور اگر کوئی شخص یہ لگان ادا کر دے تو اسے زکوٰۃ معاف ہو جاتی ہے[۴۱]

(۲۱) جو کچھ عرض کیا جا چکا ہے، اس کے باوجود بعض اصحاب کو شائد احقر کی تجویز سے پورا اتفاق نہ ہو۔ مثلاً وہ عملہ کی تنخواہ یا سیّد یا غیر مسلم پر خرچ زکوٰۃ کا صحیح مصرف ماننے پر تیار نہ ہوں۔ ان کی تسلی کے لئے عملہ کی تنخواہ کو مدات زکوٰۃ سے خارج رکھا جا سکتا ہے اور باقی کے متعلق خرچ زکوٰۃ میں متناسب تخفیف کی جا سکتی ہے مثلاً اگر ان مدات کا خرچ ۲۷ کروڑ ہے اور سادات اور غیر مسلم آبادی کا نواں حصہ ہیں تو ۲۷ کروڑ میں سے ۳ کروڑ منہا کر کے صرف ۲۴ کروڑ زکوٰۃ میں محسوب ہو سکتے ہیں۔

(۲۲) جو زکوٰۃ کمیٹی حکومت نے قائم کی تھی، گو عام طور پر اس کی سفارشات ٹیکس کو زکوٰۃ میں مجرا کرنے کے برخلاف ہیں۔ پھر بھی بعض سے خاکسار کی تجویز کو تقویت پہنچتی نظر آتی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں: "صنعت کے بارے میں اس پر اتفاق ہوا کہ مشینری پر زکوٰۃ عائد نہ ہوگی۔ وہ صرف خام مال پر جو کارخانوں میں موجود ہو اور مصنوعات پر جو کارخانوں کی پیداوار ہو، عائد ہوگی۔ یہ اصول چھوٹے بڑے کارخانوں کے تمام انفرادی مالکوں پر عائد ہوگا۔ اگر یہ افراد دیگر محاصل ادا کر رہے ہیں تو ان کے ادا کئے ہوئے محاصل تا بحد ڈھائی فی صدی زکوٰۃ قرار دیئے جائیں گے"[۴۲]

میرے لئے یہ بتانا ممکن نہیں کہ اس اصول کو ماننے کے بعد جو خط کشیدہ الفاظ میں بیان ہوا ہے، دوسرے ٹیکس دہندگان پر اس کا اطلاق کیوں نہیں کیا گیا۔ میری درخواست یہ ہے کہ دوسرے ٹیکس دینے والوں کو بھی یہی سہولت مرحمت فرمائی جائے۔ اس کمیٹی کے ممبر شاہ مسعود احمد صاحب کی رائے قابل غور ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "البتہ اگر حکومت چاہے تو کسی ٹیکس کے کسی جزء کو کسی فرد کی طرف سے زکوٰۃ میں

---

[۴۱] اُردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد اوّل ص ۵۲۴

[۴۲] پاکستان گزٹ خصوصی مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۵۴ء ص ۱۴۵۹

محسوب کر سکتی ہے۔ بشرطیکہ دینے والا بھی اسے منظور کرے" ۴۳؎ اس شرط کو خاکسار نے پورا کر دیا ہے۔

(۲۳) حکومت کے اخراجات کی ان مدات کی تعیین کے بعد جو مصارف زکوٰۃ ہیں، باقی کام آسان رہ جاتا ہے اس کے لئے دو چیزیں کرنا ہوں گی۔

(ا) ان مدات کے خرچ کو ایک جگہ جمع کر لیا جائے اور

(ب) زکوٰۃ کے گوشواروں کی جزوی تنقیح کے بعد زکوٰۃ کی رقم کو بھی ایک جگہ جمع کر لیا جائے اور اس کا مقابلہ شق (۳) کی مجموعی رقم سے کر کے یہ دیکھا جائے کہ آیا یہ اس سے زیادہ یا برابر یا کم ہے اور اس کے مطابق ٹیکس دہندگان کو بذریعہ اعلان مطلع کر دیا جائے۔

ان دونوں فرائض میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو حکومت کے حساب وکتاب اور تنقیح کی معمولات سے باہر ہو۔ گو قدرے زائد کام ضرور ہے مگر یہ بھی کوئی خاص زیادہ نہیں۔

(۲۴) اپنی دانست میں خاکسار نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ زکوٰۃ کے بارے میں جو تجویز ۴۴؎ سطور بالا میں پیش کی گئی ہے، اس کی راہ میں کوئی شرعی، انتظامی یا فنی رکاوٹ حائل نہیں ہے، اور اگر حکومت اس معاملہ میں اپنی مذہبی اور پاکستان کی صورت میں اپنی آئینی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا چاہتی ہے تو آسانی سے ہو سکتی ہے۔ وما علینا الا البلاغ

۴۳؎ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ص ۱۴۷۸

۴۴؎ پیرا ۳۔ "جو خرچ حکومت ان کاموں پر صرف کرتی ہے، جو مصرف زکوٰۃ ہیں، اس کے محاذی ٹیکس دہندگان کا ٹیکس زکوٰۃ میں مجرا ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے یہ درکار ہوگا کہ ٹیکس دینے والا اپنے ادا کردہ ٹیکس اور اس میں مشمولہ رقم زکوٰۃ سے حکومت کو مطلع کرے .... ان اعلان کردہ رقوم کو ایک طرف جمع کر لیا جائے اور دوسری طرف ان سب مدّات کے خرچ کو جمع کر لیا جائے جو مصرفِ زکوٰۃ ہیں۔ اگر موخر الذکر زکوٰۃ کی رقم کے برابر یا اس سے زائد ہو تو ٹیکس دہندگان کو مزید زکوٰۃ ادا کرنے کی ضرورت نہ ہوگی لیکن اگر کم ہو، مثلاً اسّی فی صد کے برابر تو حکومت کو اعلان کرنا ہوگا کہ زکوٰۃ کا ۱/۵ حصہ زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے ذمے رہ گیا ہے۔ وہ اسے خود ادا کر دیں۔"